ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.04 (2025)

مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں بہاؤ، راکھ اور خس و خاشاک زمانے میں سوانحی عناصر، شخصی تجربات اور تخلیقی اظہار کا تنقیدی مطالعہ

A CRITICAL STUDY OF BIOGRAPHICAL ELEMENTS, PERSONAL EXPERIENCES, AND CREATIVE EXPRESSION IN MUSTANSAR HUSSAIN TARAR'S NOVELS BAHAO, RAAKH, AND KHAS-O-KHASHAK ZAMANE MEIN

سرفراز احمد

پی ایچ ڈی اسکالر لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر محمد عطاءاللہ

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو لاہور لیڈز یونی ورسٹی، لاہور

Abstract:

*Mustansar Hussain Tarar holds a unique creative identity within the realm of Urdu novel writing. His novels prominently feature the individual and collective experiences of human life, historical events, cultural shifts, migration, social upheaval, and various manifestations of human tragedy. A study of his work reveals that he does not merely construct fictional characters and events; rather, he creatively presents the historical, social, and cultural experiences of his era. His observations, recollections, life experiences, and keen insight into human behavior play a significant role in the intellectual and artistic framework of his novels. This research examines selected novels by Mustansar Hussain Tarar—specifically *Bahao*, *Raakh*, and *Khas-o-Khashak Zamane*—to explore how the author's personal experiences and observations are integrated into the creative narrative of his fiction. Furthermore, it investigates how the author portrays the historical landscape of the Subcontinent, the repercussions of the Partition, the disintegration of culture, the experience of migration, and the rise and fall of human life through the themes and characters within these novels.*

Key words: Mustansar Hussain Tarar. Realm of Urdu novel. human life,historical events,cultural shifts,migration.social upheaval

ناول میں دستاویزیت سے مراد مختلف ذرائع سے حاصل کی جانے والی حقیقی معلومات ناول میں اس طرح استعمال کرنا کہ وہ قصے کا جزو بن جائے۔ ناول کیوں کہ زندگی کی عکاسی کرتا ہے اس لیے اس میں زندگی کے حقائق کے انجذاب کی گنجائش موجود ہے۔ جب ناول نگار اپنے ناول کے خام مواد کے حصول کے لیے معلومات تک رسائی حاصل کرتا ہے اور مخصوص تاریخ، تہذیب، نفسیات، سائنس، مذہب، فلسفہ یا دیگر علوم کا مطالعہ کرتا ہے، حقائق کی دریافت کے لیے تحقیق سے کام لیتا ہے تو مصنف کی یہ شعوری کاوش اور جستجو اس ناول کو دستاویزیت کے زمرے میں لے آتا ہے۔ اردو ادب میں بہت سے ایسے ناول ہیں جن کی تخلیق کے لیے ناول نگار کو تحقیق کے مراحل سے گزرنا پڑا اور پھر تاریخی، مذہبی، سماجی حقائق کو ناول میں گوندھ کر پیش کیا۔ ان ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، مستنصر حسین تارڑ، عبد اللہ حسین، طارق محمود، فضل احمد کریم فضلی، شوکت صدیق وغیرہ شامل ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول اردو ناول کی روایت میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے ہاں دستاویزی رجحان کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے خاص طور پر ان کے ناول " بہاؤ" اور " راکھ" اسی دستاویزیت کے حامل ہیں۔ "بہاؤ" "قبل از تاریخ کی بستی کی کہانی اور راکھ" بیسویں صدی کے نصف آخر کے پاکستان کی کہانی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول " بہاؤ" اردو کے چند بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول میں ایک قدیم بستی کی معدومیت کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔ پانی کی تلاش سے ناول کا آغاز ہوتا ہے اور پانی ہی کی تلاش پر اختتام ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ و تہذیب میں دریا کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ پانی زندگی کی علامت ہے جب دریا خشک ہونا شروع ہوتے ہیں تو بستیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ ناول میں تاریخ کے اس عہد کی کہانی بیان کی گئی ہے جب وادی سندھ میں آریائی قبیلے آباد ہو رہے تھے اور ور اور ان

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.04 (2025)

کے غلام بنتے جارہے تھے۔ یہ ناول بھی گھاگھرا کے کنارے آباد ایسی ہی بستی کی کہانی ہے جو دریا کے خشک ہونے پر ختم ہو جاتی ہے۔ مصنف نے دور اور اور آرین قوم کے زوال و عروج کی کہانی اس انداز سے پیش کی ہے کہ ایک عبرت کا سامان مہیا کیا ہے۔ ایک طرف دراوڑی بستی ہے جو اپنی بے عملی کی وجہ سے فطرت کا سامنا نہیں کر پاتی، بڑے پانی آنا بند ہو جاتے ہیں تو کھیت ویران ہو جاتے ہیں، مویشی مرنے لگتے ہیں اور بستی والے وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا شعور نہیں رکھتے۔ ہجرت، جستجو اور تلاش کا حوصلہ نہیں رکھتے اس لیے معدوم ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف آرین ہیں جو آگے بڑھنے کا جذبہ لیے ہوئے ہیں۔ دنیا میں Survival of the Fittest کا اصول ہمیشہ سے کار فرما ہے اور اسی اصول کے تحت آرین دراوڑوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔

قبل از تاریخ کی اس کہانی کے پیچھے مصنف کی گہری تحقیق کار فرما ہے۔ مصنف نے تحقیق اور مطالعے سے اخذ شدہ علم کو اپنے تاریخی شعور کی بدولت ایک تخیلاتی قصے میں ڈھالا ہے۔ اس ناول کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

"بہاؤ متھ ہے، تاریخ نہیں۔ یہ متھ میں نے خود تخلیق کی ہے اور متھ تھی تخلیق کی جاسکتی ہے جب حقائق پر بنیاد رکھی جاتی ہے۔ کہیں نہ کہیں حقیقت ہوتی ہے۔ سرسوتی خشک ہو گیا یہ حقیقت تھی اور یہی حقیقت بہاؤ کی بنیاد ہے۔" (1)

دریا انسانی زندگی میں مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب کسی انسان پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ دریا خشک ہونے کو ہے تو اس کے احساسات کیا ہو سکتے ہیں۔ اس کا خوف، اس کی پریشانی، اس کا عمل یہ سب محسوس کرنے لائق ہے۔ دریا تہذیب اور زندگی کی علامت ہے، جب دریا خشک ہوتا ہے تو ایک معاشرہ، ایک تہذیب، ایک بستی ناپید ہو جاتی ہے۔ معدومیت کا یہ احساس مصنف نے محسوس کیا اور پھر اس احساس کو اس ناول میں سمو دیا۔ تین ہزار سال پرانے عہد کی عکاسی کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے ایک منظم تحقیق کی ضرورت ہے اور پھر مصنف کو اس عہد میں جینا پڑتا ہے، ایک ایک کردار کے ساتھ وقت گزارنا پڑتا ہے۔ اس عہد کا احساس اور تاریخی شعور ہی کی بدولت ایسے شاہکار تخلیق کیے جاسکتے ہیں صرف تاریخی علم کے بل بوتے پر ایسی تخلیق ممکن نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر رشید امجد کے مطابق:

"یہ پوری کہانی جس طرح سوچی اور لکھی گئی ہے اس کے پیچھے ایک وسیع تاریخی، تہذیبی، ارضی، جغرافیائی اور لسانی آگاہی کا شعور موجود ہے۔ اردو میں اس طرح کے ریسرچ کام کی بنیاد پر کہانی لکھنے کا رواج کم ہی ہے۔" (2)

مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول کی تخلیق سے پہلے ایک طویل عرصہ ریسرچ میں لگایا اور اس کہانی کی عمارت قدیم دریا سرسوتی / گھاگھرا ہاکڑا کے خشک ہونے پر اٹھائی ہے۔ آریا قبائل جب خانہ بدوش زندگی سے نکل کر زرعی معاشرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے فطرت کے نافع یا ضرر رساں مظاہر کو قوت تخیل کے سہارے تقدیس عطا کر دی۔ اور گھاگھرا کو آسمانی دریا "سرسوتی" کہہ کو پکارا۔ اسی دریائے گھاگھرا کے کنارے یہ بستی آباد ہے جس کی کہانی مصنف بیان کرتا ہے۔ ناول نگار نے عمدہ فن کاری کے ساتھ قبل آریائی دراوڑی کلچر کو پس منظر میں رکھتے ہوئے ناول کی کہانی کا تانا بانا بنا ہے۔ بہاؤ کے آغاز میں پیاسا پرندہ اپنی ڈار سے جدا ہو کر پانی کی تلاش میں بستی کے باہر موجود درکھوں میں سوکھی جھیل کے کنارے گر کر مر جاتا ہے۔ کہانی کا اختتام بھی پانی کی تلاش پر ہی ہوتا ہے۔ اب کی بار یہ تلاش کسی پرندے کی نہیں بلکہ ناول کے اہم کردار ورچن کی ہے جو ڈور کا کوا اپنے ساتھ لے کر خشک سالی کا شکار اس بستی کو چھوڑ کر سفر پر نکلتا ہے۔ ناول کے تمام کردار علامتی ہیں۔ اس بستی کے متنوع کرداروں میں اہم کردار مانی کا ہے جو ایک ساتھ چار بیٹوں کی ماں بنی۔ ایک مردہ اور تین اس کے ساتھ کھیتوں میں کام کرواتے ہیں۔ قبل آریائی دراوڑی کلچر مادر سری کلچر تھا۔ جس میں عورت کی حیثیت "میا" کے زمین روپ کی ہے۔ ناول کا ایک کردار "اورچن" ہے جس کے اندر اپنی جغرا جغرافیائی حدود سے نکل کر دوسری بستیوں کو دیکھنے کی فطری خواہش موجود ہے۔ پاروشنی سیاہی مائل رنگ، گھنگریالے بھورے بال، چوڑی ناک، چھوٹے قد اور بھرپور جنسی کشش کی حامل لڑکی ہے۔ پاروشنی مردہ بچے کی پیدائش کے بعد مرد کے تعلق سے کنارہ کش ہو جاتی ہے۔ پاروشنی دھرتی ماتا کا زمینی روپ ہے وہ اپنی مٹی، ماحول اور دریا سے پیوستہ ہے۔ پاروشنی زمین کی علامت ہے جو اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ اس کے آباد کار بدل جاتے ہیں۔ بھوک پیاس سے مرتی ہوئی پاروشنی ناول کے آخری منظر میں کنگ کونتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا یہ عمل زندگی کے ارتقا کی علامت ہے۔ زمین خواہ کتنی ہی مردہ کیوں نہ ہو اس میں کہیں نہ کہیں زندگی ضرور موجود ہوتی ہے۔ ناول کا ایک اور کردار بوڑھا "دھروا" ہے جو پوتر بیلوں کے باڑے کا رکھوالا ہے۔ پکی آوا چڑھا کر مٹی کے برتن بناتی ہے اس کے بچے پینڈو اور سکرا اس کام میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ پکی مرتبان بھی بناتی ہے جن میں بستی کی رسومات تدفین کے مطابق مردے کو ڈال کر دفن کیا جاتا ہے۔ پکی مور کے پیٹ میں انسانوں اور دیگر جانوروں کی شکلیں بناتی ہے۔ مصنف نے مور کا کردار فنا کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔ سمرو بھی فنکار ہے وہ مٹکے اور نگینے گھڑتا ہے اور دریا کی سیپیوں پر بھی بیل بوٹے بناتا ہے۔ اس کے فن کی شہرت آس پاس کی بستیوں میں بھی ہے۔ گاگر می بستی والوں کے لیے پرندوں کا شکار کرتی ہے۔ ورچن کی دوستی پورن سے ہو جاتی ہے۔ ورچین دو سال مونجھو میں گزار کر واپس بستی میں آتا ہے جہاں اس کی شادی پاروشنی سے ہو جاتی ہے۔ مردہ بچے کی پیدائش کے بعد جب پاروشنی مرد کے تعلق سے بیگانہ ہو جاتی ہے تو ورچین ہڑپہ کا رخ کرتا ہے۔ چھ سات سال گزارنے کے

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.04 (2025)

بعد وہ واپس آجاتا ہے۔ ورچن کے علاوہ بستی کی موجودہ نسل کا کوئی بھی فرد کبھی بستی سے باہر نہیں گیا۔ جنگل پار جانے کا تجربہ صرف مامن ماسا نے کیا تھا اس پر فنا کا بھید کھلا اور وہ جنگل کا حصہ بن گیا۔ ورچن کے مشاہدے کے مطابق دریا کے دوسرے کنارے پر کھیتیاں تھیں جو فنا ہو گئیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بستیاں مردہ ہو سکتی ہیں اور جب بستیاں مردہ ہوتی ہیں تو صرف ٹھیکریاں ٹیلے نشانی کے طور پر رہ جاتے ہیں۔ وہ ڈور گا سے پوچھتا ہے کہ بستیاں کیسے مردہ ہوتی ہیں ڈور گا ورچن کو بتاتا ہے کہ بستیاں کیسے مردہ ہوتی ہیں:

"بستیاں باہر سے نہیں اندر سے مردہ ہوتی ہیں۔ باہر والے تو اتنے برسوں سے چلے آرہے ہیں اگر موہنجو کو انہوں نے ختم کرنا ہوتا تو کر چکے ہوتے۔۔۔ پر موہنجوا بھی تک ہے۔ اگرچہ ایسا ہونے کو ہے جیسے یہ بستی۔۔۔۔ ورچین تو پھر بستیاں کیسے مردہ ہو جاتی ہیں؟

ڈور گا: وہ لوگوں کے کڑھنے سے ہوتی ہیں۔۔۔ تو ورچن بستیاں باہر والے مردہ نہیں کرتے، کرتے ہیں پر ساری کی ساری نہیں کرتے۔ یہ ہم خود ہوتے 31 ہیں، اپنے بھائی بندوں کو جنور بنانے والے۔۔۔"(3)

بہاؤ کا تانا بانا گھاگھرا کے ارد گرد بنا گیا ہے۔ دریا کا پانی ہر سال آکر بستی کے کنارے موجود کھیتوں کو سیراب کرتا تھا۔ ناول کی ابتدا میں ہی مصنف بتاتا ہے کہ بڑے پانی زور اور مقدار میں کم ہونے کی وجہ سے کھیتوں تک نہیں پہنچ پاتے۔ آخر میں گھاگھرا سوکھنا شروع کر دیتا ہے۔ گاگھرا کے سوکھنے کا عمل اور اس کے کنارے رہنے والے سادہ دل انسانوں پر اس عمل کے بھیانک اثرات کی فن کارانہ مصوری ناول کی کہانی کو منطقی انجام تک پہنچاتی ہے۔ بستی کے لوگ بھوک، پیاس اور گرمی کی شدت سے مرنے لگتے ہیں جو بچ جاتے ہیں وہ پانی اور زندگی کی تلاش میں کسی اور طرف نکل جاتے ہیں۔ ورچن بھی بے کسی کی موت سے بچنے کے لیے گھاگھرا سے چل پڑتا ہے۔ تن تنہا پاروشنی کے آدھی مٹھی بھر کنگ کوٹنے کی آواز پر ناول کا اختتام ہوتا ہے۔ دریائے گھاگھرا کے کنارے آباد اس بستی کے باشندے رسوم و رواج کے قیدی ہیں۔ انہوں نے روشنی اور تازہ ہوا کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے جو ان کے تہذیبی جمود کی علامت ہے۔ پورن کے مکالمے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں:

"تمہاری بستی میں ساری دیواریں اندھی ہیں۔ ان میں ہوا کے لیے راستے نہیں ہیں کیوں کہ تم کہتے ہو کہ گھر کو سورج کی روشنی اور پرائے کی نظر سے بچاؤ اور ہم روشنی میں رہنا چاہتے ہیں اور پرائے کی نظر سے نظر ملا کر بات کرتے ہیں۔ یہ فرق ہے۔"(4)

روشنی میں رہنے سے یہاں مراد تغیرات زمانہ کے ساتھ رہنا ہے جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ مٹ جاتی ہیں۔ یہ ناول قاری کو بتاتا ہے کہ زوال در اصل فنا کی وہ اندھی لہر ہے جو ظلم، ظالم اور مظلوم کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ یہ المیہ ان سب بستیوں یا قوموں کا ہے جو وقت کے ساتھ چلنے کا حوصلہ اور شعور نہیں رکھتی ہیں۔ ان پر قدرت کی عنایات ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کے دریا خشک، کھیت ویران اور بستیاں نابود ہو جاتی ہیں۔ گھاگھرا کے کنارے آباد بستی بھی ایسی ہی بستیوں میں سے تھی۔" بہاؤ" میں ورچن ایک جگہ کہتا ہے:

" ہم سے پہلے بھی بہت کچھ تھا جو نہ رہا۔۔۔ اور بستیاں تھیں اور ان میں وسنیک تھے تم جیسے اور مجھ جیسے۔ اور ان بستیوں کا کیا ہوا۔ اور ہمارا کیا ہو گا۔ پاروشنی پوچھتی ہے۔"(5)

استحصال اور ظلم کی جو داستانیں " بہاؤ" میں پیش کی گئیں ہیں وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا حوالہ ہمیں قرآن پاک میں بھی ملتا ہے۔ قرآن کی آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ظلم اور ناانصافی کا حد سے گزر جانا ہی اس کی انتہا ہے، تباہی اور خاتمے کا اعلان:

ترجمہ:" یہ عذاب زدہ بستیاں تمھارے سامنے ہیں۔ انہوں نے جب ظلم کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان میں سے ہر ایک کی ہلاکت کے لیے ہم نے ایک وقت مقرر کر رکھا تھا۔"(6)

ناول کی ابتدا میں بستی والوں کے لیے سب دیوتا اور ان کے علامتی روپ مقدس تھے لیکن گھاگھرا کے پانیوں کی بے رخی نے ان کے دلوں اور جسموں کی طرح ان کے عقیدوں کو بھی شکستہ کر دیا ہے۔ مصنف نے انسانی فطرت کے اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مذہبی توجیہات کے روایتی انداز کی صورت کشی کی ہے:

" " میں بتاتا ہوں" بھکشو اب ایک نئے زور سے آگے آیا بڑے پانی کے آنے میں دیری ہوئی تھی۔ کتنے لوگ آتے ہیں ادھر لنگ پر پھول چڑھانے، تیل ڈالنے اور آگ کی جگہ میں آگ جلانے۔۔۔ تو ایسا کرو گے تو یہی ہو گا۔ بڑے پیپل کے تنے میں اب کوئی دیا جلا کر نہیں رکھتا۔۔۔ رکھوں، بوٹوں اور پانیوں میں بھی تو جان ہوتی ہے اور ہماری جان ہوتی ہے تو ہم ان کا دھیان کیوں نہیں کرتے۔۔۔ تو یہی ہو گا۔

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.04 (2025)

بڑے پانی کیوں نہیں آئے۔ پر اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں۔۔۔ یہ صرف وہ پانی جانتے ہیں کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ پاروشنی کی آواز مدہم تھی۔ اور وہ یہ کہہ کر پرے ہو گئی۔ " میں بتاتا ہوں "بھکشو نے سر ہلایا۔ مجھ سے پوچھو، جو شے تمھیں سب سے بھلی لگتی ہے وہ گھاگھرا کو دے دو۔۔۔ دے دو تو یہ مان جائے گا اور پانی آئیں گے۔"(7)

ناول کے تہذیبی و ثقافتی تناظر میں بستی کا بھکشو در اصل ایک وسیع تر مذہبی اجارہ داری کا اشارہ ہے۔ آفات و حادثات کی غیر حقیقت پسندانہ توجیہات کے انداز نے پروہتائی نظام کو تقویت دی جو قبل آریائی کلچر کے زوال پذیر ہونے کا سبب بنا۔ یہ وہ تہذیبی و سماجی دستاویز ہے جسے مصنف نے بہت تحقیق کے بعد دریافت کیا ہے اور اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے افسانے کے قالب میں ڈھالا ہے۔

" بہاؤ" میں ما قبل تاریخ عہد کو تخیل اور تحقیقی شواہد و آثار کے بل پر تخلیقی لمس عطا کر کے حیات نو عطا کی گئی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ناول کے متعلق بتاتے ہیں:

" "بہاؤ" کی بستی میں نے خود آباد کی تھی۔ وہاں کے جنگل بیلے میں نے خود تخلیق کیے تھے۔ درخت، جانور، جھاڑیاں، دلدل، دریا سب میری تخلیق ہیں۔ اور اس تخلیق میں مجھے تحقیق سے بہت مدد لینی پڑی۔"(8)

مستنصر حسین تارڑ ناول کی تحقیق کے سلسلے میں شدید عرق ریزی کا احوال بیان کرتے ہیں۔ ان کے مطابق سات آٹھ سال برس کہانی کے مواد کی تحقیق و تشکیل اور چار پانچ برس اسے لکھنے میں لگے۔ مصنف نے ایک ایسے عہد کا انتخاب کیا ہے جب آریائی اپنا کلچر لے کر برصغیر میں فاتحانہ حیثیت سے آباد ہو رہے تھے۔ ناول میں پیش کردہ زمانے کے مطابق آرین موہنجوڈارو اور ہڑپہ کو اپنے تصرف میں کر چکے ہیں۔ " بہاؤ" قبل از تاریخ کے اس دور کی باز آفرینی کرتا ہے جب دریائے سندھ کی گھاٹی میں شمال مغرب کی جانب سے آریاؤں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔(9) " بہاؤ" کی بستی کانسی (Bronze Age) کے زمانے میں آباد ہے۔ لیکن اپنے آلات پیداوار ، وسائل معاش، سماجی تنظیم اور بعض دیگر اسالیب حیات کے اعتبار سے حجری دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کہانی کا عرصہ تقریباً سات ہزار برس پرانا ہے۔(10) قدیم دریا سرسوتی کے خشک ہونے پر لکھی گئی یہ کہانی بتاتی ہے کہ اس عہد کے قبائل خانہ بدوش طرز زندگی سے نکل کر زرعی معاشرے میں کیسے داخل ہوتے ہیں۔ ابتدا میں بستی والوں کے لیے سب دیوتا اور ان کے علامتی روپ مقدس تھے لیکن گھاگھرا کے پانیوں کی بے رخی نے ان کے دلوں اور جسموں کے ساتھ ان کے عقیدوں کو بھی شکستہ کر دیا۔ آفات و حادثات کی غیر حقیقت پسندانہ توجیہات کے انداز نے رسوم پرستی اور پروہتائی نظام کو تقویت دی جو قبل آریائی کلچر کے زوال پذیر ہونے کا سبب بنا۔ قبل آریائی تہذیب و ثقافت کی معدومیت کے متعلق اب یہی خیال کیا جاتا ہے کہ قدرتی آفات، کسان بغاوتوں، حکومت کی کمزوری، مذہبی نظام، دریائی گزرگاہوں میں تبدیلی یا بین الاقوامی (مثلاً سومیر سے) تجارت کے انقطاع نے آریاؤں کے لیے ہندوستانی چراگاہوں اور زرخیز سیلابی مٹی والی زمینوں پر قبضہ جمانا آسان کر دیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے مقامی نسلوں کے کثیر گروہوں کو بھی اپنا داس یا پسو بنالیا۔

"بہاؤ" کا موضوع تاریخ ہے جس کے جلو میں تہذیب و ثقافت کے بننے اور بگڑنے کی داستان ہے۔ ناول کے دو کردار پورن اور ورچن دو مختلف سوچ کے حامل کردار ہیں۔ پورن عمل اور محنت کا استعارہ ہے، وہ آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ جب کہ ورچن وہ دراوڑی باشندہ ہے جو بے عملی کا مارا ہوا ہے۔ اسی بے عملی کی وجہ سے رفتہ رفتہ معدوم ہوتا چلا جاتا ہے۔ پورن کا ورچن کے ساتھ یہ مکالمہ اس عہد کی معدومیت کی حقیقت بیان کرتا ہے:

"اور چن تمہارے جسموں میں آلکس ہے اور تمہاری آنکھوں میں نیند اور تمہارے دریا ست ہو چکے ہیں۔ کوئی بھی زمین کا پتر نہیں ہوتا۔ نرا اس زمین پر پیدا ہونے سے وہ تمہاری نہیں ہو جاتی جب تک کہ تم اس کی خدمت نہ کرو، اس کی چاکری نہ کرو۔ تمہاری بانہوں میں تو زور ہی نہیں رہا۔ تم کیا خدمت کرو گے۔"(11)

یہ تخلیق تحقیق کے بغیر ممکن نہیں تھی۔ مستنصر حسین تارڑ اپنی ان تحقیقی کاوشوں اور تحقیق و تخلیق کے رشتے کے حوالے سے بتاتے ہیں:

"بہاؤ کے علاوہ بھی جو اس قسم کے تحقیقی اناول لکھے گئے ہیں۔ اس میں ناول نگار کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی ساری تحقیق ناول میں کھپا دے اور یوں قاری کو متاثر کرنے کے لیے وہ سارے ہی حوالے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز تھی کہ میں اس سے بچنا چاہتا تھا۔ یعنی میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ قاری کو یہ احساس ہو کہ ناول نگار نے بہت زیادہ تحقیق کی ہے۔ بلکہ ہلکا سا احساس ہو، شائبہ ہو۔ تحقیق تخلیق سے الگ ہو کر اپنا تعارف نہ کروانے لگ جائے۔ وہ ماحول کا جزو بن کر کہانی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے۔ اب رہی یہ بات کہ اس کے تحقیقی ماخذ کون سے تھے تو ایک تو جناب ابن حنیف ملتان نے میری بہت رہنمائی کی۔ ویدوں کے انگریزی ترجموں سے، خصوصاً دریاؤں کے حوالے سے، اس سے مجھے بہت مدد ملی۔ دریائے سرسوتی یا مختلف دریا اور شہر ہیں جو نابود ہو چکے ہیں۔ ان سے متعلق بہت کچھ پڑھا۔ سندھ کی تہذیب

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.04 (2025)

پر جو کتابیں تھیں یا مصری تہذیب کے بارے میں جو تحقیق تھی۔ پھر یہ تہذیب سر زمین تک ہی محدود نہ تھی۔ میں نے پرانے مذاہب کا بھی مطالعہ کیا۔ خوابوں کی تعبیریں کیا کی جاتی تھیں۔ سبھی حوالوں سے میں نے پڑھا۔"(12)

مصنف نے " بہاؤ" کی زبان پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ قبل از تاریخ زمانے کی زبان کیسی ہو سکتی تھی اس کا لمس ہمیں اس ناول میں محسوس ہوتا ہے۔ سو سال بعد زبان کا مزاج بدل جاتا ہے اور یہ ناول تو ہزاروں سال پرانی تہذیب پیش کر رہا ہے۔ اس ناول کی زبان اور الفاظ کے انتخاب میں مصنف کو تحقیق کے مرحلے سے گزرنا پڑا ہے:

" میں نے بہت تحقیق کی۔ دراوڑی زبان کا کوئی نہ کوئی رنگ بولا جا رہا ہے آج بھی۔۔۔ جناب فرید کوئی اور جناب علی عباس جلال پوری ماہر لسانیات ہیں میں نے ان سے تفصیلی گفتگو کی۔ ان دونوں نے پنجابی کی ایک خاص لغت بنا کر دی کہ یہ الفاظ بنیادی طور پر دراوڑی زبان کے الفاظ تھے جو آج بھی پنجابی میں مستعمل ہیں۔ میں نے " بہاؤ" میں ان سے مدد لی۔"(13)

مستنصر حسین تارڑ نے زبان، الفاظ، تراکیب، تشبیہات، استعارے، علامات ان سب کے لیے قدیم زبانوں پر تحقیق کی اور وہ انداز اپنایا جو اس ناول کو اس قدیم دور کے قریب تر کر سکتا تھا۔ تارڑ نے کرداروں کے نام بھی ایسے استعمال کیے ہیں جو اسی عہد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ گجرو، مامن، پکلی، درچن، پاروشنی، سکریہ نام اجنبیت اور مانوسیت دونوں پہلو لیے ہوئے ہے ہوئے ہیں۔ ناول کا ایسا ماحول تخلیق کرتے ہیں جس میں ہم اسی عہد میں سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں۔ عبد اللہ حسین اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"۔۔۔ اس ناول میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی بات اس کی حیرت انگیز زبان ہے۔ جہاں تک میرا علم ہے وادی سندھ کی قدیم تاریخی تحریریں آج تک ڈی سائفر نہیں کی گئیں۔ اس ناول کی کہانی کا تانا بانا (انفراسٹرکچر) زبان کو اور زبان کا تانا بانا کہانی کو اس طور باہم کندھا دیتے ہیں کہ قاری کا ذہن اس بات کو تسلیم کر لیتا ہے کہ اس زمانے میں، اس مقام پر، یہی بولی بولی جاتی ہو گی۔"(14)

ان کی تحقیق کا یہ عالم تھا کہ جو نئی معلومات حاصل ہوتیں ان کو استعمال کرنے کے لیے ناول میں وقتاً فوقتاً ردوبدل بھی کرتے رہے۔ اس عہد کے پرندوں اور جانوروں تک کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس ناول کی تحقیق و تخلیق میں مصنف نے بارہ برس صرف کیے ہیں:

" مجھے اس کی تحقیق اور تخلیق میں بارہ ب 1 رس لگ گئے۔ سات آٹھ برس تو میں نے اسے سوچتے، مواد اکٹھا کرتے غرض تحقیق کی ضرورتیں پوری کرنے میں اور چار پانچ برس لکھنے میں لگے۔ تین مرتبہ Rewrite کیا۔"(15)

مستنصر حسین تارڑ وقت اور حیات کے تسلسل پر یقین رکھتے ہیں۔ نسلیں بدلتی رہتی ہیں، بستیاں اجڑتی رہتی ہیں لیکن انہی خطوں میں سے پھر سے زندگی کے اکھوے پھوٹتے ہیں۔ " بہاؤ" کی کہانی جس معاشرے کو تخلیق کرتی ہے وہ آج کے عہد سے تعلق قائم کرتا دکھائی دیتا ہے۔ قبل از تاریخ کے کرداروں اور آج کے باشندوں میں ایک گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ یہ ناول اپنے موضوع اور بلیغ تہذیبی معنویت کے اعتبار سے ایک عام نہیں بلکہ خاص اور منفرد ناول ہے۔ قبل آریائی کلچر بر صغیر کی تاریخ کا اولین روشن باب ہے جس کے بعض اہم اجزا کو مصنف نے بامعنی انداز میں اردو ناول کی روایت کا حصہ بنایا ہے۔ یہ ناول تاریخ کے غیر تحریری ریکارڈ کو درست کرنے کی ایک تخلیقی کاوش ہے۔(16) "بہاؤ" ایک خالص دستاویزی رجحان کا ناول ہے جس کو مکمل تخیل کی بنیاد پر افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان بھی اسے دستاویزی ناول قرار دیتے ہیں:

"قرۃ العین حیدر نے " آگ کا دریا" کے لیے ماقبل تاریخ کی بجائے محفوظ Recorded تاریخ کو جنم دیا تھا اور شروع کے ابواب میں برصغیر کے قدیم ماحول کی بازیافت کے لیے کچھ ہندی الفاظ انتہائی فنکارانہ انداز سے استعمال کیے تھے جو اس ماحول پر سجتے بھی تھے بالکل یہ عمل مستنصر حسین تارڑ نے بھی دہرایا ہے مگر انہوں نے زبان کو دریافت بھی کیا ہے اور ساتھ ہی اس معدوم ہوتے ہوئے کلچر اور ماحول کو بھی جو وقت کے ساتھ فنا ہو گیا۔ اس کے پیچھے جو دستاویزیت Documentation کی تشکیل سے وابستہ محققانہ ریاضت ہے وہ قابل تعریف عمل ہے۔ اس لیے اسے ہم ایک Docu-Novel بھی کہہ سکتے ہیں۔"(17)

یہ ناول اپنے موضوع، کرداروں، ماحول، زبان، منظر نگاری اور بلیغ تہذیبی معنویت کے اعتبار سے ایک عام نہیں بلکہ خاص اور مختلف ناول ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی تحقیق نے اس ناول کو دستاویزی ناول کی ذیل میں لا کھڑا کیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول " راکھ" اصل میں " بہاؤ" ہی کے سلسلے کی اگلی کڑی ہے اسی لیے اس ناول کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے " بہاؤ" کا پس منظر ضروری ہے۔ "راکھ" ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۲ء تک ہماری پچاس سالہ تاریخ کی دستاویز ہے، ہمارے دکھ، سکھ، کامیابیوں اور ناکامیوں کی دستاویز۔ ناول میں پاکستان کا حقیقی منظر

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.04 (2025)

نامہ پیش کیا گیا ہے جو سیاست، بیوروکریسی اور عسکری قوت کے گرد گھومتا ہے۔ "راکھ" خاکستر ہونے اور بکھرنے کی علامت ہے۔ یہ پاکستانی قوم کی رگ رگ میں اترتے زوال کی علامت ہے۔

ناول کا عنوان "راکھ" رکھنے کے پیچھے بھی ایک خاص سوچ کار فرما ہے۔ ناول کے آغاز میں قرآن کی یہ آیت نقل کی گئی ہے:

"جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، ان کے کاموں کی مثال راکھ کی ہے، جس پر آندھی والے دن زور کی ہوا چلی۔ وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہ سب سے بڑی گمراہی ہے۔" (18)

تیز آندھی میں بکھر جانے والی راکھ، یہی ہماری پچاس سالہ تاریخ کا سرمایہ ہے۔ "بہاؤ" کا معدومیت کا المیہ یہاں بھی دکھائی دیتا ہے۔ "بہاؤ" کا دریا گھاگھرا خشک ہو رہا تھا اور "راکھ" کا راوی۔ وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت نہ رکھنے والی قومیں وقت کے تیز بہاؤ اور آندھی میں راکھ کی طرح بکھر جاتی ہیں:

"راکھ، بہاؤ کا تسلسل ہے۔ راکھ کشمی مینشن شاہ عالمی کی عمارتوں سے اڑی اور ہمارے چہرے ڈھک گئے۔ ابھی اس کو پونچھ بھی نہ سکے تھے کہ مشرقی پاکستان کی راکھ نے پورے چہرے کو چھپا لیا۔ راکھ سمبل ہے تہذیب کے ختم ہونے گا۔ راکھ میں چنگاری ہوتی ہے۔ یعنی اس اور امید کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ۔" (19)

اس امید کا یہی نہ ختم ہونے والا سلسلہ آگے بڑھنے کی جستجو پیدا کرتا ہے۔ تارڑ کے اس "راکھ" کے ڈھیر میں امید کی چند چنگاریاں بھی موجود ہیں۔ ایسے اور چین موجود ہیں جن میں پیاس ہے، جستجو ہے اور نئی دنیاؤں کی تلاش کا مادہ ہے۔ فوزیہ چوہدری اس راکھ کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ کا ناول راکھ محض راکھ کا ڈھیر نہیں بلکہ اس میں ایسی چنگاریاں بھی جلتی بجھتی نظر آتی ہیں جو ہماری اجتماعی زندگی کی اونچ نیچ کا احاطہ کرتی ہوئی غیرت و حمیت کو ہوا دیتی ہیں اور اپنی حرارت سے زندگی کو جلا بخشتی۔" (20)

ناول کی ابتدا مشاہد کے قادر آباد کے آس پاس شکار سے ہوتی ہے۔ مشاہد کے ساتھ زاہد کا لیا اور ڈاکٹر ارشد بھی ہیں۔ مشاہد نے چار مرغابیاں شکار کی ہیں۔ ناول میں ایک قصہ ہے جو شروع سے آخر تک چلتا ہے اور ساتھ ساتھ کئی ضمنی قصے اور ان قصوں کے کردار ناول کا حصہ بنتے ہیں۔ قادر آباد میں مرغابی کے شکار سے شروع ہونے والی یہ کہانی قیام پاکستان کے وقت کے لاہور، کاشمی مینشن، کامران کی بارہ دری، دریائے راوی، چوک چکلہ، وادی سوات، کراچی کی حقیقی زندگی کو پیش کرتی ہے۔ یہ ایک طویل قصہ ہے جس میں حقیقی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔

مشاہد قادر آباد سے مرغابیوں کا شکار کر کے گھر لوٹتا ہے جہاں اس کی بیوی ہرگیتا منتظر ہے۔ اس دوران مشاہد کا چھانا بھائی مردان بھائی کو کرسمس کی مبارک باد دینے آتا ہے۔ اس ناول میں مصنف نے مشاہد اور برگیتا کی زندگی کے نشیب و فراز دکھائے ہیں۔ ناول کے باقی کرداروں نے ان دو کرداروں کا ساتھ بہت خوب صورتی سے نبھایا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے ناول کی ابتدا کرداروں کی عمر کے درمیانی حصے سے کی ہے۔ کرداروں کی زندگی میں کبھی ماضی ہے تو کبھی حال۔ مصنف نے مشاہد کی زندگی کا وہ حصہ بھی بیان کیا ہے جب وہ سکول جانے والا بچہ تھا۔ مشاہد برگیتا کے ساتھ چوک چکلے پر آتا ہے۔ اس کی محبوبہ نوراں وہیں رہتی ہے۔ ناول میں پرانی یادیں، لکشمی مینشن، سعادت حسن منٹو اس دور کا لاہور زندہ ہو جاتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کا دور الیکشن مہم عروج پر ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو، حفیظ پیرزادہ، شیر پاؤ، غلام مصطفیٰ کھر اور دیگر سیاسی رہنماؤں کے چلے، تقریریں ہو رہی ہیں۔ مردان کیپٹن کی حیثیت سے مشرقی پاکستان کی جنگ میں حصہ لیتا ہے اور سقوط ڈھاکہ کے بعد چھپ چھپا کر مغربی پاکستان پہنچتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی جنگ میں وہ بھارت کا قیدی بنا اور پھر رہا ہو کر آ گیا۔ مردان جب مشرقی پاکستان میں تھا تو مولوی احتشام کی بیٹی مہر النسا سے اس کے تعلقات ہو جاتے تو ہیں۔ مہر النسا ایک بیٹی کو جنم دے کر فوت ہو جاتی ہے اور مردان اس نومود شوبھا کو لے کر چھپتا چھپاتا پیدل سفر کر کے پاکستان پہنچتا ہے۔ جب کہ مشاہد تعلیم کے حصول لیے انگلستان جاتا ہے۔ والد کی وفات کی خبر سن کر وہ واپس آ جاتا ہے۔ برکت، برگیتا، راوٗنی ماشامل ہوتی ہے۔ ایک دن مشاہد کو بابو اور فاطمہ کا خط ملتا ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ ہم نے شادی کر لی ہے۔ فاطمہ مسلمان تھی جب کہ بابو ہندو۔ بابری مسجد کا واقعہ مہ پیش آتا ہے، شاہ عالمی کے ہنگاموں کا ذکر آتا ہے اور یہ سب اس قصے کو اس کے اختتام تک پہنچاتے ہیں۔ "راکھ" میں مشاہد، برگیتا، زاہد کا لیا اور مردان کے کردار بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول میں سعادت حسن منٹو اور ان کی بیوی صفیہ کو بھی بطور کردار پیش کیا ہے۔ کاشمی مینشن کے فلیٹ، اس دور کی شرارتیں، منٹو کی شخصیت، کہانی کی تلاش جیسی باتوں سے منٹو کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ منٹو کس طرح کہانیوں کی کھوج میں رہتے تھے اور مشاہد اور سمیعہ کی کہانی سننے کے لیے وہ اسے کسی طرح بلیک میل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ناول میں مصنف نے سب بیان کیا ہے۔ منٹو لوگوں کو دوست بناتے اور پھر کسی کمزور لمحے میں سنائی ہوئی زندگی کی کہانی کو افسانے میں بدل دیتے تھے۔ مظہر شاہ صاحب جو منٹو کے قریبی دوست ہوا کرتے تھے۔ مینشن کراوڈ میں رہتے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ بتاتے ہیں کہ کوئلہ چننے والی لڑکیاں کسی طرح شاہ صاحب کے گیراج کے پاس پہنچ کر گم ہو

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.04 (2025)

جاتی تھیں۔ ایک غائب ہو جاتی اور دوسری باہر اس کا انتظار کرتی تھی۔ ایک دن شاہ صاحب نشے کی حالت میں منٹو کو اپنی کہانی سناڈالتے ہیں اور منٹو صاحب موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ کہانی " نقوش " میں جوں کی توں چھپوا دیتے ہیں۔ شاہ صاحب منٹو پر برستے ہیں:

"شاہ صاحب برس پڑتے ۔۔۔۔۔۔ او منٹو کی ۔۔۔۔ میں اس ۔۔۔۔ منٹو کو ۔۔۔۔ ایک عرصے تک منٹو نے شاہ صاحب کے سامنے آنے سے گریز کیا۔ "(21)

تارڑ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مجھے تخلیق کا پہلا انڈی کیشن منٹو ہی سے ملا تھا۔ تارڑ نے منٹو کا خاکہ بعنوان " مینشن کا منٹو " بھی تحریر کیا:

" " حلقہ ارباب ذوق " والے یوم مغلو منا رہے تھے۔ صفیہ آپا صدارت کر رہی تھیں۔ میں نے " مینشن کا مغنوا " خاکہ پڑھا۔ بچپن کی کچھ باتیں بھی آگئی تھیں۔ صفیہ آپا کسی سطر پر ہنستی تھیں، کسی پر روتی تھیں۔ انہوں نے مجھے بہت پیار کیا۔ کہنے لگیں مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ یہ تم لڑکے تھے جو شرارتیں کرتے تھے۔ "(22)

ناول کے ایک اور کردار اللہ داد چوہدری کے متعلق بھی مصنف نے یہ کہا ہے کہ یہ حقیقی کردار کی جھلک ہے۔ اس کردار میں مصنف کے والد کی خصوصیات موجود ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اس کردار کو اپنے والد کی تصویر قرار دیتے ہیں:

" " راکھ " میں جو چوہدری اللہ داد کا کردار ہے وہ دراصل میرے والد صاحب کی ایک تصویر کہہ لیں۔ "(23)

مستنصر حسین تارڑ کے والد رحمت خان تارز، گجرات کے ایک کاشتکار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک نرم مزاج شخصیت کے مالک تھے۔ محنتی تھے اور اپنے علاقے میں پہلے میٹرک پاس تھے۔ محمود الحسن روزنامہ ایکسپریس کو انٹرویو دیتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ بتاتے ہیں:

" میرے والد کو خود پر بڑا قابو تھا۔ کسی سے درشت لہجے میں بات نہ کرتے اور ناراضی میں کسی کو الو کہنے سے زیادہ آگے نہیں جاتے۔ "(24)

ناول میں چودھری اللہ داد کے کردار پر نظر ڈالی جائے تو وہ بھی اسی مزاج کا کردار ہے۔ تارڑ ناول میں چودھری اللہ داد کا تعارف اس طرح سے کرواتے ہیں:

"نرم چودھری اللہ داد ایک سیلف میڈ شخص تھا اور اس کے باوجود دھیما اور طبیعت کا تھا۔۔۔ وہ دراز قد ہونے کے باوجود ہمیشہ سر جھکا کر چلتا تھا اور اس کے جاننے والے کھانس کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتے اور پھر سلام کرتے۔ ورنہ وہ پاس سے گزر جاتے۔ اس کی نرم دلی اس کی بیوی کے لیے ایک آزار تھی۔ "(25)

چوہدری اللہ داد فسادیوں کے ڈر سے اپنے بچوں کو گاؤں میں محفوظ مقام پر لے جاتے ہیں۔ اسی طرح ناول میں چوہدری اللہ داد کے بیٹے مشاہد میں خود مصنف کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مشاہد کا بچپن، آوارگی اور جہاں گردی کی عادت، تعلیم کے لیے انگلستان کا سفر ان سب واقعات میں مستنصر حسین تارڑ جھلکتے ہیں۔ اسی حوالے سے ایک سوال کے جواب میں تارڑ کہتے ہیں:

" مجھے یہ نقصان ہوا کہ بیشتر لوگ جو میرے قاری ہیں، میری زندگی سے بہت واقف ہیں۔ میڈیا کا بھی حصہ ہے۔۔۔ پھر سفر نامے اتنے لکھے ہیں جو آپ بیتیاں ہی ہیں تو پھر راکھ، لکھتے ہوئے میں کہیں کہیں بھول گیا کہ میں ناول لکھ رہا ہوں۔۔۔ میرے بچپن کے تجربے اس میں آگئے ہیں۔ "(26)

اگر غور کیا جائے تو ناول سوانحی عناصر سے پاک نہیں ہوتا۔ مصنف زندگی کے تجربات و مشاہدات ہی کی بنیاد پر ناول تخلیق کرتا ہے اس لیے اس میں سوانحی عناصر کا شامل ہونا بعید از قیاس نہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اس ناول کے حوالے سے اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

" دنیا میں جتنے بھی اچھے ناول لکھے گئے ہیں سبھی سیمی آٹو بائیو گرافکل ہیں۔۔۔ اگر مصنف نے زندگی گزاری ہے تو پھر وہ اپنے تجربوں کو سامنے رکھ کر لکھے گا۔ لیو ٹالسٹائی کی وار اینڈ پیس ۹۹٪ آپ بیتی ہے۔ دستوسکی کی جواری اس کی آپ بیتی ہے۔ گارسیا مارکیز نے اپنے ناول میں اپنے پورے خاندان کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ ناول تو ہے ہی تجربوں، آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں کا نام۔ "(27)

" راکھ " میں بہت سے واقعات ایسے ہیں جو اس کی دستاویزیت پر دلیل ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کا لاہور، ۱۹۶۵ء اور اے ء کی جنگ، ۱۹۷۰ء کے الیکشن، مشرقی پاکستان کے حالات، جنگی قیدی، بابری مسجد کی شہادت، لاہور مندر کا واقعہ یہ سب واقعات وہ حقائق ہیں جنہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ مصنف نے ناول میں تاریخی جبر کو واضح کیا ہے۔ ۱۹۴۷ میں جب ہر طرف نفسا نفسی، لوٹ مار ہوس اور خود غرضی کا بازار گرم تھا اس وقت بھی کچھ لوگ اپنی جڑوں سے جڑے رہنے کی خاطر اپنی جگہوں پر جم کر بیٹھے تھے۔ لکشمی مینشن کا بندرام بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھا۔

مصنف برصغیر کی تقسیم اور سقوط ڈھاکہ جیسے المیے کو ناول کا موضوع بناتا ہے قیام پاکستان سے لے کر حال تک ملک جن تہذیبی و تمدنی اور جغرافیائی بحرانوں سے گزرا تھا مصنف کی ان سب پر گہری نظر ہے۔ ان تمام حالات و واقعات کو مصنف نے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ یہ ناول ایک پر آشوب عہد کا المیہ اور زوال پذیر

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.04 (2025)

تہذیب کا نوحہ ہے۔(28) ناول میں مصنف نے انسانی تاریخ اور تہذیبی دکھوں، سیاسی و معاشرتی واقعات و حادثات اور انسانی ذہن و جذبات کے صدمات کو اپنے کرداروں کی مدد سے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ناول میں تقسیم ہند کے فسادات اور مشرقی پاکستان کا المناک قصہ بیان کیا گیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے ناول " بہاؤ" میں دریائے گھاگھر اخشک ہو رہا تھا اور " راکھ " میں راوی۔ناول کے آخری حصے میں مشاہد اور کالیا اپنی اپنی سوچوں میں گم نظر آتے ہیں۔فاطمہ بھی ان کے ساتھ ہے اور ان کو بتاتی ہے کہ بابری مسجد کو گرانے میں اس نے اپنے بیٹوں کو آشیر باد دی تھی۔مشاہد چوڑے چکلے جاتا ہے جہاں اس کی محبوبہ "نوراں" رہتی تھی وہاں اسے معلوم ہوا کہ وہ تین ماہ قبل وفات پا گئی ہے۔مشاہد اپنے آپ سے کہتا ہے " میں راکھ کرید تا تھا اور سب کچھ جل چکا تھا" ۔(29)

مستنصر حسین تارڑ ناول میں بار بار اس بات پر زور دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ وقت اور تاریخ کے تقاضوں اور اپنی تہذیب و ثقافت کی بقا کی خاطر راستے تلاش کرنا ہماری قومی، تہذیبی اور سماجی زندگی اور پہچان کے لیے بہت ضروری ہے اور اگر ہم نے وقت اور قوم کی اس اہم ضرورت کو نظر انداز کر دیا تو راکھ کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔مردان کے کردار کے ذریعے مصنف نے اس دور کے ایسے نمائندے کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے جو سقوط ڈھاکہ کے بعد اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ باوقار طریقے سے اپنے بستر پر سو سکے۔اس لیے وہ کہتا ہے:

"۔۔۔اس میں شاید میری تاریخ کا جبر شامل ہو۔میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ پروقار طریقے سے چارپائی پر سو سکوں۔"(30)

"راکھ" ایک پورے عہد اور پاکستان کی پوری قوم کا تہذ میں آئینہ دار ہے۔پاکستان وجود میں آیا تو کروڑوں مسلمانوں نے خون کی ندیاں عبور کر کے اپنی سر زمین پر قدم رکھا۔لیکن خون کا یہ سفر یہیں ختم نہیں ہوا ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا۔جنگ، فسادات اور ملکی تقسیم محض سیاسی یا جغرافیائی واقعات نہیں تھے بلکہ ان واقعات نے انسانی ذہن، جذبات اور نفسیات کو شدید متاثر کیا:

"راکھ کا خمیر جن دکھوں سے تیار ہوا ہے ان میں گروہی، گھٹیا اور بے ضمیر سیاست، جمہوری کلچر کی پامالی، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے مخطرناک نتائج بر صغیر کی تقسیم، فسادات، لوٹ مار، تشدد، انسانی خون کی ارزانی، سابق مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے سے بنگلہ دیش کی تخلیق، اصل تاریخ سے مقابلہ کرنے سے گھبراہٹ اور سکتے کی سی کیفیت،، اپنی جڑوں کی تلاش میں ناکامی، مذہبی فرقہ داریت، نظریاتی و فکری انتشار، بے سمتی اور گم ہوتی ہوئی پہچان شامل ہے۔ایک ناول میں ماجرے کی فنی اور ٹھری قوت کے ساتھ اپنے موضوعات کو سمیٹ لینا کوئی معمولی بات نہیں۔ان تمام موضوعات سے جو عطر مستنصر حسین چرز کشید کرتے ہیں اسے نوشتہ دیوار کا نام دیا جا سکتا ہے۔"(31)

مصنف نے ناول میں تاریخ کے جبر کو واضح کیا ہے۔ملک کی تقسیم کے وقت جب ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا اس وقت بھی کچھ لوگ اپنی جڑوں سے جڑے رہنے کی خاطر جمے ہوئے تھے۔ناول تقسیم ملک اور سقوط ڈھاکہ جیسے المیے کو موضوع بناتا ہے۔قیام پاکستان سے لے کر دور حاضر تک ملک جن تہذیبی و تمدنی اور جغرافیائی بحرانوں سے گزرا ہے ان سب پر مصنف کی گہری نظر ہے۔یہ ناول قوموں کے زوال کی علامت ہے۔ایک ایسا زوال جو پاکستانی قوم کی رگ رگ میں اتر رہا ہے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

"۔۔۔انھوں نے راکھ میں سابق مشرقی پاکستان کی علاحدگی یعنی سقوط ڈھاکہ اور اس کے ذمہ دار کرداروں کو بھی ماجرے کا اہم حصہ بنایا ہے کہ ہم نے تاریخ کو مسخ کیا ہے۔جھوٹ اور کذب بیانی کو اتنا پھیلا دیا ہے کہ جب سچ سامنے آتا ہے تو ہم چکرا جاتے ہیں۔"(32)

راکھ تاریخی ناول نہیں ہے بلکہ تاریخیت کا حامل ناول ہے۔مصنف نے اپنے تاریخی شعور کی بنیاد پر اس ناول کو تخلیق کیا ہے۔ڈاکٹر ناہید قمر لکھتی ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ کا ناول راکھ ابھی مروجہ معنوں میں تاریخی ناول نہ ہوتے ہوئے بھی مصنف کے تاریخی و سیاسی شعور کا واضح طور پر عکاس ہے۔"(33)

"راکھ" ایک پر آشوب عہد کا المیہ اور زوال پذیر تہذیب کا نوحہ ہے ناول میں مصنف نے فسادات اور جنگوں سے انسانی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔سقوط ڈھاکہ کے نتیجے میں مردان کے اندر پیدا ہونے والی فرسٹریشن اور نفرت کے ساتھ شوبھا کا کردار اس المیے کی جانب اشارہ کرتا ہے جس نے ایک ملک کے درمیان صرف جغرافیائی لکیر ہی نہیں کھینچی بلکہ ایک ہی قوم کے افراد کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔۱۹۷۱ء کا المیہ نام نہاد رہنماؤں کی دین ہے۔جنھوں نے اپنے ذاتی مفاد اور اپنی انا کی خاطر سماجی، سیاسی اور معاشی اقدار کی دھجیاں اڑا دیں۔اس عہد کے برسر اقتدار ہوس پرست نمائندوں نے تمام قوم کے منہ پر راکھ کا لیپ کر دیا ہے۔(34) اس ناول کے ذریعے مصنف نے ایک ایسی حقیقت سامنے رکھ دی ہے جس سے ہم چاہ کر بھی نظریں نہیں چرا سکتے۔یہ ناول ایک پورے عہد کی تاریخی دستاویز ہے۔

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.04 (2025)

" خس و خاشاک زمانے " مستنصر حسین تارڑ کا ناول ہے۔ اردو ادب میں یہ ناول ایک اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناول کا آغاز برصغیر کی تقسیم سے قبل سے ہوتا ہے لیکن اس کا اصل موضوع نو آزاد اسلامی مملکت پاکستان کی زوال زدہ اقدار اور یہاں انسانوں کے ساتھ بیتنے والی دلدوز داستان کا بیان ہے۔ ناول نگار نے سقوط ڈھاکہ کے اسباب کا تجزیہ قطعی تخلیقی انداز میں کیا ہے۔ احساسِ زیاں کے ناپید ہونے کا ذکر وہ سقوط ڈھاکہ کے سانحے کے حوالے سے یوں کرتے ہیں:

"جب مردہ پرندے چھتوں پر گر رہے تھے تو دار السطنت کی رات میں شمار سے حواس باختہ ایک شخص برہنہ حالت میں بھاگتا چلا آرہا تھا اور اس کے جلو میں صدارتی محافظوں کی درجنوں جیپیں ہوٹر بھائی اس کی حفاظت کے لیے چلی آتی ہیں اور ان جیپوں میں اس شخص کے جسے مذہبی جماعت نے غازی قرار دیا تھا چند سوت ہیں تاکہ وہ اپنے تن کو ان سے ڈھانپ سکتے ۔۔۔ وہ بمشکل ان کے قابو میں آتا ہے اور نعرہ لگاتا ہے ۔۔۔ جنگ جاری رہے گی ۔۔۔ وہ بیچارہ محض ایک بہانہ تھا ۔۔۔ سارے جرم اس کے کھاتے میں ڈال دیے گئے تھے اور پوری قوم بری الذمہ ہو گئی تھی ۔۔۔ جب کہ قوم کا ہر فرد اس جرم میں نا صرف شریک تھا بلکہ فخر کرتا تھا کہ تھینک گاڈ ۔۔۔ پاکستان بچ گیا ۔۔۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد" (35)

ناول نگار نے ناول میں پاکستان کی تاریخ کے معروف کرداروں کو بالکل واضح کر کے لکھا ہے جس کے سبب ناول کبھی کبھی تاریخ کی ایک کتاب محسوس ہونے لگتا ہے۔ مصنف جن کرداروں کو پسند نہیں کرتا ان کے خلاف اپنے تعصب کا اظہار واضح انداز میں کرتا ہے۔ اگرچہ اس سے ناول کی تخلیقی حیثیت متاثر ہوتی ہے تاہم جذبات کی اس شدت میں تاریخی واقعات اجلے انداز میں سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس ناول کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"خس و خاشاک زمانے " پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ ہمارا زبین ناول نگار تاریخ اور وقت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا شاید اسکی وجہ یہ بھی ہو کہ ہماری تاریخ تقسیم ہند سے جڑی ہوئی زندگی میں مسلم غیر مسلم تعلقات، غیر مسلم فاتحین کی ہندوستان میں آمد، نو آبادیاتی دور، غیر ملکی سلطنت کا خاتمہ، دو قومی نظریے کا پرچار ہندو مسلم آویزش کے عوام الناس کے اذہان پر ان مٹ اثرات، تبدیہی کایا کلپ، پاکستان کی تخلیق، کم علمی کے باعث ضعیف الاعتقادی، تنگ نظری، توہم پرستی اور جاہلانہ عقائد اور مختلف النوع تعصبات کی مشترکہ داستان لکھی ہوئی ہے۔" (36)

"خس و خاشاک زمانے " اپنے کرداروں بخت جہاں، لہناں سنگھ، امرت کور، سروسانسی، امیر بخش، ماہلو، موہن سنگھ، گوبند و نونہال سنگھ وغیرہ کے حوالے سے بیسویں صدی کے سماجی، معاشرتی، تہذیبی تاریخی اور کسی حد تک سیاسی منظر نامے کا احاطہ کرتا ہے۔ ناول برصغیر کے کرداروں کو اس کے اپنے جغرافیے سے باہر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا باسی بنا کر پیش کرتا ہے۔

ناول کے آغاز میں ناول کا ایک کردار بخت جہاں انتہائی مجبوری اور بے کسی کی حالت میں دکھایا گیا ہے وہ اپنی بھتیجی نور بیگم سے مری ہوئی مرضی مانگتا ہے تاکہ اسے بھون کر کھا سکے۔ اس کا جاٹ پن دھواں دھواں ہو چکا ہے یہاں بخت جہاں ایک قسم کا سانسی نسل کا مردار خور بن چکا ہے۔ بخت جہاں اور لہناں سنگھ دونوں گہرے دوست تھے اور سات کیکر کی شراب ڈٹ کر پیتے تھے۔ لہناں سنگھ کی بیوی امرت کور نے نیلی آنکھوں والے حسین بخت جہاں کو دیکھا اور ریجھ گئی اور ایک دن اپنے دو بچوں کو بند اور نونہال کو لے کر بخت جہاں کے پاس آگئی۔ امرت کور مسلمان ہو گئی اور کنیز فاطمہ نام رکھ دونوں بچوں کے نام بھی تبدیل کر کے گوبند سنگھ کا نام فتح محمد اور نہال سنگھ کا نام غلام محمد رکھا گیا۔ ماہلو کم زمین رکھنے والے تین بچوں کے باپ امام بخش سے شادی کرنے پر تیار ہے اور بالآخر یہ شادی ہو کر رہتی ہے۔ لہناں سنگھ تقسیم کے بعد چھپ چھپا کر اپنے گاؤں آتا ہے اور بخت جہاں سے ملتا ہے۔ بخت جہاں اپنی بھتیجی کے در پہ پڑا ہوا ہے جس کی وہ شادی نہیں ہونے دیتا لیکن بخت جہاں کا غرور آج بھی قائم ہے۔ ناول کی ابتدا سے لے کر آخر تک بخت جہاں کے رویے جاٹ پن کی نفسیاتی جہات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ کردار "رسی جل گئی پر بل نہیں گیا" کی خوب صورت مثال ہے۔ ناول کا ایک کردار رچرڈ جہاں بھی ہے جس کے خون میں ایک چینی کا خون بھی شامل ہے اور بخت جہاں کو علم بھی نہ ہو گا کہ پچیسویں گھنٹے میں اس کی نسل ایک رچرڈ جہاں بھی تخلیق کرے گی۔ لہناں سنگھ بخت جہاں پر طنز کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے تکبر والا اور ظلم کرنے والا ہے تو بخت جہان طیش میں آکر کہتا ہے:

"لہناں سنگھ مجھے ایسا ہی بنایا گیا ہے۔ میرے رب نے اور تیرے واہگرو نے مجھے ایسا ہی بنایا ہے اس میں میرا کیا دوش ہے۔ یقین کر کہ اگر آج بھی مجھ میں ہمت اور سکت ہوتی تو میں ویسائی قاہر اور متکبر ہوتا۔ میں اپنی سگی بھتیجیوں کی ڈولیاں نہیں اٹھنے دیتا۔ میری خصلات کی مٹی ابھی نہیں بدلی۔ یہ تو عمر کا زوال اور غربت کی مجبوری ہے ورنہ میں کڑی یا ہوا اس کا تکیہ کلام) بھلا کب کسی کے قابو میں آتا تھا۔" (37)

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگیں کبھی نہ بھولنے والے واقعات ہیں۔ تارڑ کے لیے یہ واقعات ناقابل فراموش ہیں۔ قتل عام، عبادت گاہوں کا اجڑنا اور مذہب کی بنیاد پر مخالفین کو تہہ تیغ کرنا تارڑ ان تمام واقعات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ناول میں بنگلہ دیش کے قیام کے پس منظر میں مقدس بانو کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ ناول تاریخ کی اہم دستاویز قرار دی جا سکتی ہے:

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.04 (2025)

" مابعد تقسیم کے کیسے کیسے واقعاتی پہلو" آگ کا دریا" سے لے کر "خس و خاشاک زمانے تک" ناولوں میں انڈے چلے آتے ہیں۔ اور ماضی کی تاریخ کے انوکھے انسانی روپ دکھاتے ہیں۔ وقت میں انسان کو آگے ہی بڑھنا ہوتا ہے لیکن تاریخ کے رہوار پر سوار ہو کر شاید تمام ہی قوموں کا وقت میں پیچھے کی جانب دیکھنے کا سفر ان کے مقدر کا کھیل ہے سن ۲۰۱۰ء میں چھپنے والے ناول نے بھی یہی کارنامہ ایک تحریر کے ذریعے سر انجام دیا ہے جس کی مختلف النوع کرنہیں ناول کے کینوس پر جابجا پھیلی ہوئی ہیں اور آج کے دور میں جب کہ وقت کی کمی کے مسائل نے ذہنی الجھنوں کو جنم دیا ہے اس کو ایک ضخیم دستاویزی شکل دے دی ہے۔"(38)

مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں بہاؤ، راکھ اور خس و خاشاک زمانے کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی ناول نگاری محض تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ اس میں مصنف کے ذاتی مشاہدات، زندگی کے تجربات، تاریخی شعور، تہذیبی آگہی اور اجتماعی انسانی احساسات کی گہری آمیزش موجود ہے۔ ان کے ناولوں میں انفرادی زندگی کے تجربات اجتماعی تاریخ اور تہذیبی حافظے سے مربوط ہو کر ایک وسیع تخلیقی کائنات تشکیل دیتے ہیں۔ مصنف اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، تاریخی اور تہذیبی حالات کو محض واقعات کی صورت میں پیش نہیں کرتے بلکہ انہیں انسانی زندگی کے تجربات، جذبات، احساسات اور المیوں کے ساتھ مربوط کر کے فنی اظہار عطا کرتے ہیں۔

حوالہ جات

(1) مستنصر حسین تارڑ، ناول نگار مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو، انٹرویو قرۃ العین طاہرہ، مشمولہ، تسطیر، لاہور، شمارہ ۹ - ۱۰، جولائی اگست، ۱۹۹۹ء، ص ۳۲

(2) رشید امجد، ڈاکٹر، " بہاؤ" ایک جائزہ، مشمولہ، شاعری کی سیاسی اور فکری روایت، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۵

(3) مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۹۶-۹۷

(4) مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، ص ۶۴

(5) مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، ص ۱۴۵

(6) سورۃ الکہف، آیت نمبر ۵۹

(7) مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، ص ۱۹۹

(8) مستنصر حسین تارڑ، ناول نگار مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو، انٹرویو قرۃ العین طاہرہ، ص ۳۰

(9) خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، اردو مجلس، دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۳۴۴

(10) رشید امجد، ڈاکٹر، " بہاؤ" ایک جائزہ، ص ۱۲۴

(11) مستنصر حسین تارڑ، بہاؤ، ص ۶۳

(12) مستنصر حسین تارڑ، ناول نگار مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو، انٹرویو قرۃ العین طاہرہ، ص ۳۱۔ ۳۲

(13) مستنصر حسین تارڑ، ناول نگار مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو، انٹرویو قرۃ العین طاہرہ، ص 31-32

(14) عبداللہ حسین، فلیپ، بہاؤ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء

(15) مستنصر حسین تارڑ، ناول نگار مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو، انٹرویو قرۃ العین طاہرہ، ص ۲۹

(16) رشید امجد، ڈاکٹر، " بہاؤ" ایک جائزہ، ص ۱۳۷

(17) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے چند اہم زاویے، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۶

(18) قرآن پاک، سورۃ ابراہیم ۱۴، آیت ۱۸

(19) مستنصر حسین تارڑ، ناول نگار مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو، ص ۳۴

(20) فوزیہ چوہدری، راکھ کی کرید، مشمولہ ماہنامہ تخلیق، لاہور، جلد ۲۸، شمارہ ۱۲، دسمبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۰

(21) مستنصر حسین تارڑ، راکھ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۹۱

(22) مستنصر حسین تارڑ، ناول نگار مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو، ص ۳۶

(23) مستنصر حسین تارز، انٹرویو، روزنامہ جنگ، راولپنڈی، سنڈے میگزین، ۱۲۴ اپریل، ۲۰۱۱ء

ISSN E: 3006-1466
ISSN P: 3006-1458
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
CJSSR
CONTEMPORARY JOURNAL OF SOCIAL SCIENCE REVIEW
Vol.03 No.04 (2025)

(24) مستنصر حسین چرز، انٹرویو، محمود الحسن، مشمولہ، روزنامہ ایکسپریس، لاہور، ۱۰ اگست ۲۰۱۱، ص ۱۲
(25) مستنصر حسین تارز اراکھ، ص ۱۰۸
(26) مستنصر حسین تارز، ناول نگار مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو، ص ۳۲
(27) مستنصر حسین تارز، ناول نگار مستنصر حسین تارڑ سے گفتگو، ص ۳۳
(28) محمد افضال بٹ رڈاکٹر اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹، ص ۳۴۲
(29) مستنصر حسین تارڑ، راکہ ص ۵۶۶
(30) مستنصر حسین تارز، راکہ، ص ۱۰۱
(31) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۲۰۰۸، ص ۲۸۰
(32) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس، کراچی، ۲۰۱۲، ص ۲۱۳
(33) ناہید قمر، ڈاکٹر اردو ادب میں تارمانیت، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۷،، ص ۲۰
(34) محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، ص ۳۴۲
(35) مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱، ص ۲۸۸
(36) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، خش و خاشاک زمانے اور نئے آدم کی تلاش، مشمولہ، معیار، شمارہ ۸، جولائی دسمبر ۲۰۱۲، ص ۳۹۰
(37) مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، ص ۳۸۰
(38) ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، خش و خاشاک زمانے اور نئے آدم کی تلاش، ص ۳۹۴